

ناولٹ

لاہور آنے سے پہلے اسے جتنی خوشی تھی وہ یہاں آنے کے بعد دن بدن زائل ہوتی چلی گئی۔ وہاں اگرچہ وہ کچھ کچھ بیزار اور وہاں کی لگی بندھی روئین سے خائف رہتی تھی، لیکن لاہور آنے کے بعد تو جیسے نئی نئی فکروں اور پریشانیوں نے اس کی جان ہی پکڑ لی تھی۔ وہ صبح و شام انگلیوں پہ حساب کتاب جوڑتے جوڑتے ہلکان ہو جاتی۔ ابھی شام کو یونہی روزمرہ کی بات چیت میں اس نے سرسری سا ذکر ہی اس بات کا انصر سے کیا تو وہ چھوٹے ہی بولا۔

”صحیح کہتے ہیں سیانے، عورت کو مطمئن رکھنا ناممکنات میں سے ہے وہاں تھیں تو ادھر کی زندگی سے

فائزہ افتخار

سچی سلطنت

بیزار، اب اپنے من چاہے شہر آئی ہو تو یہاں سے بھی شکایتیں۔

”میں کوئی عادتاً تو شکایت نہیں کر رہی انصر! بلکہ شکایت ہی نہیں کر رہی یونہی تذکرہ کر دیا کہ کتنا فرق پڑا ہے یہاں آنے سے۔“ وہ شرمندہ ہو گئی۔

”تو بھگتو اب خواہش بھی تو تمہاری ہی تھی نا لاہور آ کے بسنے کی۔“ اس کی بات پہ وہ دیکھتی رہ گئی۔

”یہاں آنے میں میری کسی خواہش کا دخل نہیں، یہ آپ بھی جانتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے، میں وہاں کی زندگی سے غیر مطمئن تھی لیکن پھر بھی گزارا کرتی رہی۔ یہ تو آپ کی ٹرانسفر بھی جو لاہور لے آئی۔ میری خواہش یہ آنا ہوتا تو بہت پہلے ہی چلے آتے۔“ وہ محض

سوچ کے رہ گئی کہ شادی کے بعد تو گویا اس نے ابھی لفظ شکوے کا ادا کرنا خود پہ حرام کر لیا تھا۔

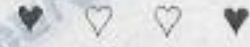
”مرد کا ساتھ آسمان پہ نکلے سورج کی طرح ہے۔“

دادو کے الفاظ آج بھی من و عن یادداشت محفوظ تھے۔ ”بیٹا! جس طرح سورج کی دھوپ کسی موسم میں چھیتی ہے، جھلساتی ہے اور کسی موسم راحت کا سبب بنتی ہے، کسی وقت اس کی کھال چھید دیتی ہیں اور کسی رت میں اس کی ہڈیوں تک میں سنگون پہنچا دیتی ہیں، اپنی نرم حرارت سے۔ اسی طرح مرد کے ساتھ میں بھی

پیش ہے، ابھی ٹھنڈک، سورج کی روشنی کہیں کچھ پودے بھلے ہی ملنا جاتے ہوں مگر اپنی کوکھ ہری کرنے کے لیے کون کی ضرورت ہے۔ بنا مرد کے عورت کا ”عورت پن“ بھی ادا نہیں ہوتا ہے۔ اپنی تکمیل کے لیے وہ مرد کی محتاج رہتی ہے، اس لیے بیٹا! کبھی کبھی کی گرمی برداشت کرنا سورج کر کہ چاہے کتنی بھی آگ کیوں نہ ہو سورج، کبھی کسی نے یہ خواہش بھی کی ہے کہ سورج نہ نکلے۔“

دلہن بنی شستہ نے دادو کی باتیں نہایت سنی تھیں اور ایک اچھی مشرقی بیٹی سے ایک بننے کے لیے خود کو ذہنی طور پر بالکل تیار کر لیا تھا۔

بڑے ٹھنڈے مزاج کا واقع ہوا تھا، تینوں بڑی مندیں بیابانی ہوئی تھیں اور دوسرے شہروں میں ہونے کی وجہ سے مہینوں میں چکر لگتے تھے۔ ساس شادی کے سات ماہ بعد ہی وفات پا گئیں۔ اس کے دلہنا پے کے دن ساس کی خدمت کرتے گزرے پھر بھلا وہ کیوں نہ اسے دعائیں دیتیں۔



شستہ لاہور جیسے بڑے شہر سے بیاہ کر گجرات گئی تھی۔ لاہور میں بھی کسی شادی کی تقریب میں اس کی سب سے بڑی نند نے اسے دیکھا اور بھائی کے لیے پسند کر لیا۔ امی، ابو کچھ متامل تھے کہ لاہور میں پیدا ہوئی، پلی بڑھی، ہوم اکناکس کالج سے گریجوٹ اپنی اکلوتی بیٹی کو اس پسماندہ شہر میں کیسے بھیج دیں۔ دوسری طرف لڑکانہ صرف خوبو اور تعلیم یافتہ تھا بلکہ واپڈا میں اچھے عہدے پر بھی تھا۔ ابو کی چھان بین کے بعد اس کا ایماندار اور اصول پرست سرکاری افسر ہونا بھی ثابت ہو گیا جو ان کی پہلی ترجیح تھی۔ امی کے لیے بھرے پرے سسرال کا بکھیرانہ ہونے کا تصور خوش کن تھا۔ پھر دادو کے فیصلے پہ سب نے یہ سوچ کے رضامندی ظاہر کر دی کہ چھوٹے شہر میں رہنے کے باوجود سب بہن بھائی تعلیم یافتہ تھے، گھرانے میں شائستگی اور خاندانی وقار نظر آتا تھا، شستہ ایڈجسٹ کر لی گئی۔ اسے بھی پہلے پہل ایڈجسٹ کر لینا کوئی خاص دشوار نہ لگا۔ نئی نئی شادی کا خمار، ہر دن ہی نیانیا سا لگتا اور پھر شادی کے ڈیڑھ ماہ بعد ہی انصر کے ٹرانسفر آرڈر آگئے۔

”مترانوالی؟ یہ کون سا شہر ہے؟“ وہ روبانسی ہو رہی تھی۔

”شہر نہیں، ترقی یافتہ قسم کا گاؤں ہے۔“

”گاؤں تو گاؤں ہی ہوتا ہے اس میں کیا ترقی یافتہ اور کیا ترقی پذیر وہاں کیا کنوؤں پہ ریموٹ کنٹرول ڈول لٹکے ہوتے ہیں۔“ اس کی جھٹا جھٹ پھر انصر ہنس پڑا۔

”میرا کہنے کا مطلب ہے وہ کوئی ایسا پسماندہ قسم کا

گاؤں نہیں جیسا کہ تم اس کے نام سے تصور کر رہی ہو، ٹیلی فون، گیس، بجلی سب سہولتیں ہیں گھر کے طرح کے محلے اور علاقے ہیں اور یوں بھی اور اماں کو تو وہاں رہنا نہیں کیونکہ یہاں اماں چل رہا ہے، وقت بے وقت طبیعت خراب ہو جائے، ڈاکٹر کے پاس لے جایا جاسکتا ہے اور تمہیں یہی ظاہر ہے اماں کے ساتھ ہی رہنا ہو گا۔“ اس نے کہا۔

مگر وہ اور ہر اسماں ہو گئی۔

”تو کیا میں آپ کے بغیر رہوں گی؟ آپ وہاں

یہاں۔“

”میں آتا جا رہا ہوں گا شستہ۔ جب پاور ہاؤس

ہو جائے تو ہو سکتا ہے۔ میں واپس اپنے ہی شہر آ

اور اگر بالفرض وہاں ٹھینات ہو گیا تو پھر میری

پیشی ہے، پھر میں جناب ایک اچھی سی گاڑی لوں

ہر روز اپنی بیگم کے ہاتھ کا کھانا کھاؤں گا۔“ اس

شستہ کی انگلیاں لبوں سے لگائیں۔ حسب

دیکھ لیتا تو گھر گزرتا تھا، اس کے علاوہ

ضرورت ہوتی، موجود ہوتا۔ اس وقت

نے ان کا ہنی مون پیریڈ اور لمبا کر دیا تھا۔ وہ دونوں

بھی ہفتے بعد ایسے ملتے جیسے نئے نئے پرچی بڑے

کے ہفتوں کے بعد مل پائے ہوں۔ جس شام انصر کو

ہوتا، اس کا دل کانٹے نہیں کھتا تھا، اس کے ہاتھ

کھانے بناتی، گھر کو سنوارتی، خود کو سجاتی۔ ساری

ساری رات ایک دوسرے سے باتیں کرتے،

نظروں کی پیاس بجھائے نہ جھکتی۔ اس روئین

خلل آیا جب عرصہ سے گردوں کے عارضہ میں

اماں جان وفات پا گئیں۔ سات ماہ کے دن رات

ساتھ نے اماں سے اس کی وابستگی شدید کر دی

ہوتا بھی کون تھا ساس، بہو کے ساتھ۔ وہ بلک بلک

یوں روئی کہ اس کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ابھی

دن پہلے ڈاکٹر نے اسے ماں بننے کی خوشخبری سنائی

اس لیے طبیعت پہلے سے گری گری تھی غم کی شدت

سے اور نڈھال ہو گئی تو انصر نے بہنوں کے مشورے

اپنی امی کے ساتھ لاہور جانے کی اجازت

دی، پھر یہ قیام لمبا ہی ہوتا چلا گیا۔ اس کا دل کچھ

اماں نے انصر کو دھیرج سے سمجھایا کہ پہلی پہلی بار

لالی کو ماں بننے کے مرحلے میں کتنی احتیاط کی

جاتی ہے۔

اماں نہ تو کوئی تجربہ کار خاتون ہے جو اس کا دھیان

رکھے، نہ ہی طبی سہولتیں ایسی ہیں کہ کسی ایمر جیسی

نوری مدد مل سکے لہذا اپنا اسے ڈیوری تک یہیں

رکھے۔ پھر تو اللہ رکھے خیر سے تمہیں سدا اکٹھے ہی

ہو، تم ہر ہفتے مل جایا کرو۔“

اس پید اہوا تو یہ عقد مل گیا کہ اتنی ننھی سی جان کو

لالی انجان جگہ میں کیا سنبھال پائے گی۔

ار اپنے کو ہوش تو پکڑنے دو بیٹے، پھر لے جانا خیر

ہو گی کو۔ دیکھو تو ذرا کیا ننھا سا وجود ہے چرخہ کے

پہلوں پر۔ اتنا کمزور اور نازک بچہ ہے کبھی کھانسی، کبھی

کی خرابی، کبھی نزلہ، شستہ نے کبھی بچے سنبھالے

تو اسے پتا بھی چلے کہ کب کس وقت بچے کو کیا

ہو گیا ضرورت محسوس ہو رہی ہے وہ تو ہر بار

اس کے رونے پہ فیڈر ہی منہ سے لگا دے گی، ڈر اسے

الٹا تو سیکھ لینے دو۔“

اور یوں اپنا ہی بچہ پالنا سیکھنے میں اس نے مزید پانچ ماہ

کار دیے، اس کے بعد بھی امی کے پاس مقبول بہانا

لاہور وہ یہ کہ بچے کی پہلی سرخی سخت ہوتی ہے اور

علاقوں میں تو پالا پڑتا بھی کڑا ہے۔ مگر اس بار انصر

ایک نہ سنی اور اسے لے کر مترانوالی چلا آیا۔ پھر

اس کے دو سال بعد انصر ہوئی اور اس کے اگلے ہی

سال انصر نے ان کی فیملی مکمل کر دی مگر کسی بھی ڈیوری

لے انصر نے اسے لاہور نہ بھیجا، امی خود ہی وقت پہ

اس اور کچھ دن رہ کے چلی جاتیں۔ یہاں اس کے

ایک فل ٹائم ملازمہ رکھ چھوڑی تھی انصر نے اور

درت کے وقت بھی کئی تجربہ کار عورتیں مل جاتیں

بعض معاوضے پہ اور بعض تو رضا کارانہ طور پر ہی

ان کی دیکھ بھال کرنے کا کام کرتیں۔ گجرات میں

گزرے چند مہینے تو پھر بھی اچھے گزر گئے تھے۔ ساس کی وجہ سے رشہ داروں کا آنا جانا لگتا تھا۔ مندیں بھی ماں سے ماہ بہ ماہ ملنے چلی آتیں اور پھر انصر تھا جس سے ہفتے ہفتے بعد ملنے کی چاہ ان کی ازدواجی زندگی کو ترو تازہ کیے رکھتی، مگر یہاں اس شہر میں جو نام کا ہی شہر تھا ورنہ ایک مکمل دیہات والی تمام خوبیاں اس میں پائی جاتی تھیں، وہ اپنا دل لگانے میں قطعی ناکام رہی تھی۔ پاور ہاؤس مکمل ہونے کے بعد انصر اسی امریا میں ٹھینات ہو گیا تھا بلکہ اس کا عہدہ بھی بڑھ گیا تھا۔ گاؤں میں تو یوں بھی سرکاری افسروں کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ اتنے مہینوں تک گھرداری کے خرچوں سے آزاد رہنے کے باعث انصر نے بچت کر کے ایک سیکنڈ ہینڈ سوڑو کی ایف ایکس بھی خرید لی تھی۔ گاڑی جیسے جیسے اونچے نیچے رستوں سے گرواڑائی آگے بڑھتی رہی، اس کی مایوسی بڑھتی چلی گئی۔

بالکل گاؤں والی بچی لگیاں، مکان اگرچہ پکے تھے مگر بیشتر سیمنٹ اور روغن سے محروم، کئی ایک پہ مین کی چھتیں۔ ہر گلی کے کونے پہ گدھے کی جسامت کے خوفناک کتے بدبو دار متعفن نالیاں، ان پہ بیٹھے آدھے ننگے بچے اور بچوں پہ جھنجھٹائی کھیاں اس نے انس کو سینے سے بچھینچ لیا۔ اس کی اڑی رنگت پہ وہ مسکرا دیا۔

”یہ اندرونی مترانوالی ہے، قدیم محلہ۔ میں نے رہائش آفس کے قریب ہی رکھی ہے۔ وہ ہے تو اسی شہر کی حدود میں مگر نئی آبادی ہے۔ مکان بھی نئے تعمیر شدہ اور جدید سہولیات سے مزین ہیں۔ آس پاس اور بھی سرکاری افسران رہتے ہیں کچھ یہاں کے مقامی لوگ بھی ہیں یوں سمجھ لو کہ وہ مترانوالی کے متمول علاقوں میں شمار ہوتا ہے جیسے لاہور میں ڈیفنس، کراچی میں کلفٹن۔“ اور یوں وہ ہچکولے کھاتی مترانوالی کے ”ڈیفنس“ پہنچی تھی۔

کئی پلاٹ خالی پڑے تھے، جن پہ قد آدم جھاڑاگ آیا تھا، گائے بھینسیں آزادانہ چر رہی تھیں، سڑکیں کشادہ اور پکی تھیں۔ جتنے بھی مکان تھے سب ہی نئے

بنے ہوئے اور تقریباً ایک ہی ڈیزائن کے تھے۔ ایک قدر مشترک یہ بھی تھی کہ سب میں ہی ”پینڈوپن“ نمایاں تھا۔ غالباً یہاں ان لوگوں کی رہائش نسبتاً زیادہ تھی جن کے اہل خانہ میں سے کوئی دیہی یا کویت تک پہنچ گیا تھا اور وہ پرانے محلے سے نئی آبادی اٹھ آئے تھے۔ مگر اپنا طرز رہائش وہ وہاں بھول کر نہیں آئے تھے، ساتھ ہی لے آئے تھے مکانوں کی تعمیر میں گہرے گہرے شوخ رنگوں کا استعمال وافر مقدار میں ہوا تھا۔ کئی نے تو چاند ستارے بیرونی دیواروں پہ سجا رکھے تھے، کئی کے ماربل کے بنے پکے فرشوں پہ بندھی بھینس بھی نظر آرہی تھی۔ اس نے انصر کی توجہ دلائی۔

”بھئی دیہاتی لوگ ہیں، گھروں میں جانور باندھنے کی عادی ہیں۔ تم پر کوئی لازم تو نہیں کہ تم بھی اپنے گھر کے صحن میں بکریاں یا مرغیاں پالو۔ ادھر ادھر مت دیکھو اور اپنا گھر اپنی مرضی سے سجاؤ۔“

کرائے کے لحاظ سے ان کا گھر واقعی بڑا کشادہ تھا مگر وہی بھدے رنگ، نقش و نگار، مکان کی پیشانی پہ ماشاء اللہ، حق باہو وغیرہ خوش خط لکھے تھے۔ چھت پہ لگے سفید لوہے کے جنگلے پہ رنگ برنگ عجیب ڈیزائن کے پھول تے بنے تھے۔ دروازوں کے رنگ سبزی مانگل نیلے تھے، دیواروں پہ گلابی قلمی تھی حتیٰ کہ فرش کا چپس بھی نیلے، گلابی اور پیلے رنگوں میں تھا۔ کچن اگرچہ کافی بڑا تھا مگر پرانے فیشن کا۔ زمین پہ بیٹھ کے پکانے کا سہم تھا۔ اسے کھڑے ہو کے کوکنگ کرنے کی عادت تھی اور یہاں چولہا اونچا رکھنے کا کوئی انتظام ہی نہیں تھا اس نے ایک پرانی میز رکھوائی اور اس پہ چولہا نصب کر لیا۔ غسل خانہ رہائشی کمروں سے باہر صحن میں تھا۔ کڑکٹی سردیوں میں جب چھوٹے بچے کے ساتھ راتوں کو اٹھ کے باہر جانا پڑتا تو مالک مکان سے کہہ کے بڑے والے بیڈ روم کے ایک کونے میں دیواریں کھڑی کر کے مختصر سا بیچ ٹواکٹ بنوا لیا۔ وہ

ہوم اکناکس کی اسٹوڈنٹ تھی۔ مگر اسے کروٹیاں میکنگ کے فنون میں ماہر۔ جینز میں اپنے ہاتھ سے کئی آرائشی نمونے نکال کے سجائے۔ چپے سنوار کے قابل دید بنایا۔ پھر بھی اس کا دل نہ لگا یہاں۔ مندریں تو گجرات میں بھی کئی مینوں آتیں یہاں آکر تو وہ دونوں بالکل کٹ کے رہ گئے۔ داروں سے عید، بقر عید پہ وہ لاہور چلے جاتے جہاں کی دو بہنوں کے علاوہ شستہ کا پورا میکہ بھی آباد تھا۔ فیصل آباد میں انصر کی چھوٹی بہنیں رہتی تھیں وہاں مل آتے مگر ان میں سے کوئی کبھی بھی یہاں نہ آیا۔ لاہور میں وہ فارغ رہتی، سارا دن نئے نئے سنبھالتیں پھر بھی وہ ایسے گزر جاتا، یہاں مکمل داری اور چھوٹے بچوں کے ساتھ کے باوجود وہ سالانہ رجو کمروں کی صفائی کرتی، باہر کے فرش دھو کر یہ کمروں کا پھیلاوا سیٹتی، ڈسٹنگ کرتی، مشین لگا کر تور جو کپڑے پھیلا بھی دیتی، خشک کپڑے استری بھی دیتی، کھانا پکاتی تو وہ برتن دھو دیتی۔ اس بڑا ہوا تو اس کے اسکول جانے کا مسئلہ ہوا اس کے ساتھ ہی انعم بھی اسکول جانے کے والا ہو گئی تو اس نے دل کڑا کر کے انصر کو انہیں گجرات کے اسکول میں داخل کرانے کی اجازت دے دی۔ انصر کے دوست کے بچے بھی پڑھتے تھے اور اس کا راز پیلے سے ہی ادھر کا تھا مگر شستہ کا دل نہیں مانتا تھا۔ چھوٹے بچوں کو اتنی دور کے اسکول بھیجنے کو وہ ساڑھے چھ بجے گھر سے نکلتے اور تین بجے واپس مگر اس کے سوا چارہ بھی تو نہیں تھا اس علاقے میں کوئی اسکول ایسا نہ تھا کہ وہاں بچوں کو داخل کر سکتا۔

جیسے تمہے کر کے چار ساڑھے چار سال گزارا ہی تھے کہ انصر کے ٹرانسفر آرڈر آگئے۔ اس کی بروموشن کر کے اسے لاہور بھیجا جا رہا تھا۔ وہ مکمل غمی، بچے بھی چمکنے لگے یہ جان کر کہ نانا اور پھوپھو گھر جانے کے لیے اب انہیں عید اور گرمیوں کی

ہالٹ کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ انصر نے شغشنگ کے لیے ایک ہفتے کی چھٹیاں مقرر انوالی میں چونکہ سرکاری کوارٹر اور فلیٹ اس تھے اس لیے اس نے وہاں رہائشی مکان کرائے پہ حاصل کیا تھا اور اسے محکمے کی جانب سے تنخواہ میں لایا۔ الاؤنس دیا جاتا تھا، لیکن لاہور میں راوی روڈ پہ ہارباستان سے کچھ ہی فاصلے پہ یہ پل کے ساتھ بنی گجرات میں فرسٹ فلور پہ ایک فلیٹ اسے الاٹ ہوا۔ شستہ نے دیکھا تو حیران رہ گئی۔

”یہ فلیٹ..... اتنے بڑے گریڈ کے اعلا فلیٹ ملا ہے تو چھوٹے ملازمین کے کوارٹرز کا کیا مل سکا۔“

دروازہ کھلتے ہی برآمدہ نما رابدری تھی جس کی بیرونی قسمت جالی کی دیوار تھی، جس سے تازہ ہوا باہر آتی، بمشکل اندر آتی تھی، اور دوسری جانب دو دروازے تھے ایک دروازہ ڈرائنگ ڈائننگ میں کھلتا، دوسرا لاؤنج میں۔ لاؤنج میں سے بیڈ روم، کچن اور ڈرائنگ روم کے دروازے کھلتے تھے۔

ایک جانب دیوار گیر الٹا داری بھی نصب تھی۔ میسر نما صحن اتنا مختصر تھا کہ وہاں بمشکل کپڑے دھونے اور سکھانے کا ہی نظام ہو سکتا تھا، بچوں کے کھیلنے کے لیے جگہ بالکل مناسب نہیں تھی۔ فلیٹ اندر سے تو پھر بھی بہتر حالت میں تھا۔ مگر باہر کی حالت ابتر تھی اور کچن باہر روم تو بہت ہی خراب حالت میں تھا۔ پست کے پلستر اکھڑے ہوئے دروازوں کے بال ٹوٹ کے لٹکے ہوئے، کچن کی دیواروں پہ چکنالی، درمیان کے دھبے، دوسرے کمروں کی دیواروں پہ سلوں کی لکیریں، کیلوں کے جا بجا نشانات۔ اس کی اس میں اپنے پچھلے گھر کا نقشہ پھرنے لگا جس میں اس وقت اسے کوئی خوبی یا کشش نظر نہیں آتی تھی۔ کم از کم ان تو اتر سے بچتے مکروہ آوازوں والے اردوں سے تو محفوظ ہی تھے۔ شہر کے داخلی

دروازے پہ ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ ہر وقت ہی ٹریفک کی بد نظمی کا شکار رہتا تھا۔ بسیں، وینیں، فلائنگ کوچز، ترک غرض ہر قبیل کی ہر چیز یا آواز بلند اپنا احساس دلاتے ہوئے اس بلڈنگ کے آگے دھواں چھوڑتے گزرتی تھی۔ پچھلے مکان کی تمام خوبیاں ایک ایک کر کے اس پہ آجا کر ہونے لگیں۔

گیٹ سے داخل ہوتے ہی بڑا سا پختہ صحن، دونوں جانب چوڑی کیاریاں پھولوں سے لدی ہوئیں، ایک جانب درخت کے سائے میں اونچا کھڑا اور اس میں لگا ہینڈ پمپ جس سے سخت گرمیوں میں بھی ٹھنڈا پانی آتا رہتا۔ دو سیڑھیاں اونچا برآمدہ جس پہ لگی چھین روشنی اور دھوپ کو بہ وقت ضرورت اندر داخل ہونے سے بچاتیں اور ستونوں سے لپٹی بلیس تازگی پیدا کرتیں۔ برآمدہ کافی کھلا سا تھا۔ سردیوں میں تو خوب ہی کام آتا۔ دھوپ سیدھی اندر اترتی اور دوپہر ڈھلے تک رہتی۔ بچے زیادہ تر یہیں کھیلتے اور پڑھتے۔ اندر رابدری تھی جس کے دو جانب کمروں کے دروازے تھے، کچن، اسٹور، ڈرائنگ، ڈائننگ، دو بڑے بیڈ روم۔

وہ تب تو چپ رہ گئی۔ امی کی طرف آکر کہے بغیر نہ رہ سکی۔

”انصر! کیا ہم اس سرکاری فلیٹ کے بجائے کہیں اور نہیں رہ سکتے۔“

”کیوں؟ پسند نہیں آیا؟“

”اتنا چھوٹا سا۔“ وہ دبے دبے لہجے میں بولی۔

”ماشاء اللہ سے تین بچے ہیں۔ اس فلیٹ میں تو ایک ہی بیڈ روم ہے اس میں بھی سب نہیں سو سکتے اور لاؤنج اس طرح کا ہے کہ اس میں کوئی بیڈ لگ ہی نہیں سکتا، ڈرائنگ ڈائننگ بھی چھوٹا ہے اور بچوں کے کھیلنے کے لیے ذرا بھی کوئی جگہ نہیں۔ کچن دیکھا آپ نے؟“

”ہاں دیکھا ہے۔ ویسا ہی ہے جیسا تم چاہتی تھیں۔ اس گھر کا بغیر شیفٹ اور بغیر کاؤنٹر کا کچن ہمیں پسند نہیں تھا اس کچن میں تو امریکن اسٹائل کے کینبٹ

ہیں ماربل کے کاؤنٹر ہیں۔“
 ”مگر کھڑے ہونے کی جگہ بھی مشکل سے بن پاتی ہے۔ فریج بھی شاید ہی رکھا جاسکے اور کینٹ اس کی لکڑی تو دیکھ کھائی لگ رہی تھی۔“
 ”اب جو بھی ہے گزارا کرو۔ گجرات والا گھر بکنے کے لیے لگا ہوا ہے۔ بہنوں کو ان کے حصے دے کے جو رقم ملے گی اس سے درمیانے درجے کے علاقے میں کوئی پلاٹ تو خریدا جاسکے گا اگر کچھ اور سال سمجھ داری سے گزارا کر لو گی تو ہم انشاء اللہ اپنا گھر بنانے کے لائق ہو جائیں گے۔ اس نے سمجھانے کی کوشش کی تو امی نے آنکھ کے اشارے سے انصر کو مطمئن رہنے کا کہا۔

”جاؤ بیٹا! تم نہاد ہو کر کچھ دیر آرام کر لو اپنے ابو کے کمرے میں، خیر سے کھانا لگے گا تو میں بلواؤں گی۔“
 اس کے جانے کے بعد شستہ کی جانب متوجہ ہوئیں۔
 ”کیسی نامناسب باتیں کر رہی ہو تم؟ وہ مرد ہو کے اپنا گھر بنانے کی فکر میں لگا ہے اور تم عورت ہو مگر ذرا احساس نہیں، ارے بچی، کرایوں اور بلوں کے چکر میں پھنس گئیں تو کبھی اپنا گھر نہ بنا سکو گی۔ کچھ سال اسی فلیٹ میں ”اوکھے سوکھے“ گزار لو۔ اسی بچت میں مکان کی تعمیر شروع کر دینا آہستہ آہستہ خیر سے اب انصر کی تنخواہ بھی تو بڑھی ہے ناں۔“ انہوں نے اپنے پسندیدہ فقرے ”خیر سے“ کی تکرار کے ساتھ بات مکمل کی تو وہ سر ہلا کے بولی۔

”جی امی جی! اسی لیے تو میں سوچ رہی ہوں کہ کرائے پر نسبتاً کوئی اچھا مکان لے لیا جائے کسی اچھے علاقے میں۔ وہاں تو ٹریفک کا شور اور آلودگی اس قدر ہے۔ میرے بچے کھلی جگہ پر رہنے کے عادی ہو گئے ہیں، اس فلیٹ میں تو ہیلنے کے لیے دو فٹ کا صحن بھی نہیں۔ کمرہ بھی کوئی فالتو نہیں کہ بچوں کے لیے الگ سے سیٹ کر دوں جبکہ وہاں کھلی چھت، بڑا سا صحن۔۔۔۔۔۔“
 ”اچھا یہ بتاؤ متر انوالی میں تم کرایہ کتنا دیتے

تھے؟“ امی بات کاٹ کر بولیں۔
 ”پہلے بارہ سو، پچھلے سال پندرہ کر دیا تھا۔“
 ”اور تنخواہ میں کتنا اضافہ ہوا ہے خیر سے؟“
 ”تین ہزار مگر آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“ وہ حیرت سے بولی۔
 ”تاکہ ذرا تمہاری خوش گمانیوں کا بخار کم کروں۔ لی بی جی چھ سال سے لاہور سے یاہر ہو، تم کیا جانو یہاں زندگی کتنی مہنگی ہو گئی ہے۔ پندرہ سو چھوڑو، تم اگر ساری زائد تنخواہ یعنی پورے تین ہزار بھی کرائے میں دینا چاہو تو اس فلیٹ جیسا مکان بھی مشکل سے مل پائے گا۔“

”کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ اسے یقین نہ آیا۔
 ”پچھلی بار پچھنیوں میں جب تم اتنی تنہیں تو میں تمہیں غمت کے گھر لے کر گئی تھی یاد ہے نا؟“ انہوں نے اس کی چچا زاد بہن کا حوالہ دیا۔ ”کرشن مگر میں اوالے پورشن میں رہتی ہے۔ تم نے دیکھے تو ہوں اس کے دونوں کمرے بغیر کھڑکیوں کے ڈوبے ڈوبے صحن کے بجائے ذرا سی بالکونی وہ بھی نیچے مالک کے صحن میں نکلتی ہے۔ بے چارے بچے کھیلنے لگیں ساتھ ہی مالک مکان شکایت پہنچ دیتے ہیں کہ شور مچا رہا ہے پورے چار ہزار کرایہ دیتی ہے وہ ان دو کمروں کا۔“
 ”کیا واقعی؟“ اس کی نگاہوں میں غمت کا گہرا کمرہ گیا۔

”ابھی تو اور سنو، تمہیں تو پتا ہے کہ خیر سے بھائی کا ناصر بیوی بچے سمیت جرمنی سیٹل ہو گیا ہے۔“ اب انہوں نے ابو کے ایک دوست کا ذکر کیا۔ ”سوریاض بھائی نے گھر کا ایک پورشن کرائے پر دیا ہے پورے آٹھ ہزار میں۔“
 ”آٹھ ہزار؟ اتنا کرایہ بھی ہوتا ہے؟“

”ارے یہ تو کچھ بھی نہیں۔ گلبرگ، ماڈل ٹاؤن، ڈیفنس میں تو پچاس پچاس ہزار کے کرائے پر اسی کوٹھیاں ملتی ہیں، فلیٹوں تک کے کرائے ہیں

یہ اوپر ہیں میں نے تو صرف تمہیں متوسط علاقوں کے ریٹ بتائے تھے۔ اب تم خود سوچو، کرائے کا مکان کہاں کہاں کی عقلندی ہے، یہی تو سرکاری ملازمت کی سہولت ہے، اگر تنخواہ کم ملتی ہے تو دیگر مراعات تو ملتی ہیں۔ کرایہ نہیں، بجلی، جتنی مرضی استعمال کرو، پانی، گیس کی بھی فکر نہیں، مالک مکان کی چیخ نہیں۔“
 ”اس اور کیا چاہیے۔“

”اب ایسا بھی تمہیں کہ تمام سرکاری افسران محکمے کے لاٹ کروہ رہائشی جگہوں پر ہی رہتے ہوں، آخر اس بھائی جان بھی تو ہیں شادمان میں کمرشل ایریا میں کوئی ہے ان کی۔ جس لحاظ سے آپ نے کرائے پائے ہیں ان کی کو بھی کچھ پندرہ ہزار سے کم کرائے پر ابھی اور وہ انصر کے کزن رجب بھائی جان، وہ بھی اسی محلے میں ہیں، انصر سے کم گریڈ ہے ان کا اور گجرات میں ان کا بڑا اور اچھا ذاتی مکان ہے۔ یہ سب کیسے انور ڈکھ رہے ہیں پھر؟“

”اوہ، اتفاقاً سمجھا تھا، مگر بات بیٹھتی ہی نہیں۔“ امی چڑھ گئیں۔ ”اب امی کی بھی نہیں تم سمجھ نہ پاؤ کہ سرکاری حکاموں کی تبرک کی طرح والی تنخواہوں کے باوجود یہ لوگ جائیدادیں کیسے کمائی کر لیتے ہیں، حرام کی کمائی سے نری حرام کی۔ اب خدا کا واسطہ ہے، کتنی بن کے یہ مت پوچھنے بیٹھو، حرام کی کمائی کیسی ہوتی ہے۔“ امی چیخ چیخ پڑ گئی۔

اور اسے یہ باور کرانے کی ضرورت تو تھی نہیں کہ حرام کی کمائی کیا ہوتی ہے۔ ابو سے ساری عمر ہی حرام کمانے والوں کے لیے الغنائیں اور گالیاں سنی تھیں۔ وہ کاروباری آدمی تھے، دیانت دار اور کھرے۔ سب ان سے کوسوں دور رہ کے اپنا بزنس کیا تھا۔ ان کے بزنس شروع کرنے والے ”جدید کاروباری حکموں“ کو نت نئے نام دے کر جائز قرار دیتے

تھے کہ ان کے کہاں پہنچ گئے تھے مگر وہ اپنی اسی بھری زندگی سے خوش تھے اور اس کا سہرا اپنی

ایمانداری کے بعد امی کی صبر و شکر والی عادت کے سر باندھتے تھے۔
 اس نے ابو کی بات نہایت دھیان سے سن کر ذہن میں نجانے کیسے بٹھالی، امی کی باتوں سے اس کی آنکھیں کھل گئیں، وہ لرز اٹھی۔

”امی ٹھیک کہتی ہیں۔ کچھ عرصہ ایسے ہی سہی۔ زندگی بھیلی پیہ چھپے نقش تو نہیں جو انسان جیسے لے کر پیدا ہوا سدا ویسے ہی رہیں گے۔ یہ اتار چڑھاؤ تو آتے ہی رہتے ہیں۔ مجھے ثابت قدمی سے اپنے شوہر کا ساتھ دینا ہے تاکہ ان کے اگلے کردار پر کوئی دھبہ نہ لگے۔“
 اس نے تہیہ کیا اور خوش دلی سے شفٹنگ میں جت گئی۔

مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ آج کے زمانے میں ایمان کے رستے یہ ثابت قدمی سے ڈٹے رہنا صرف مرد کے لیے ہی مشکل نہیں بلکہ عورتوں کے لیے بھی کتنا دشوار ہے اس کا اندازہ اسے کچھ ہی دنوں میں ہو گیا تھا۔ امی نے تو صرف کرائے کے مکانوں کی بابت اسے آگاہ کیا تھا، دیگر اخراجات کا ذکر کرنا وہ بھول گئیں۔ وہ ہر چیز کی قیمت کا مقابلہ اس چھوٹے سے قصبے کی قیمتوں سے کرتی تو ہکا بکارہ جاتی۔ پورے متر انوالی میں مرغی کی کوئی باقاعدہ دکان نہ تھی، ہاں دیسی مرغی اور انڈے مل جاتے تھے دراصل دیہاتی علاقوں میں اب بھی مرغی صرف مہمان نوازی کے لیے مخصوص ہے۔ انصر گجرات کے نزدیک اپنے دوست کے پولٹری فارم سے مہینے بھر کے لیے اکٹھا مرغی کا گوشت خاصی رعایتی قیمت پر لے آتا تھا۔ گوشت کے لیے بھی دو یا تین دکانیں تھیں جہاں اسی نوے روپے کلو تک گوشت اچھا مل جاتا تھا۔ مگر یہاں تو مرغی کا ہی ریٹ نوے روپے کلو تک پہنچا ہوا تھا اور بکرے کے سوا سو روپے بچے چند گنی چنی سبزیاں ہی کھانا پسند کرتے تھے، ”آلو، مٹر، گاجر وغیرہ“ گوشت بھی خاص رغبت سے نہیں کھاتے تھے ہاں کباب یا کوٹے بنے ہوتے تو کھا لیتے البتہ والیں وغیرہ دونوں چھوٹے بچے شوق سے کھاتے تھے۔ خود وہ

سبزیاں پسند کرتی تھی مگر انصر کو دال اور سبزی بنا گوشت کے تو ہضم ہی نہ ہوتی تھی۔ دال چاول بننے، آلو ٹنڈے یا کسی اور سبزی کی بھیجا تو وہ برے برے منہ بناتا رہتا۔ اسے اٹھ کر کباب تلنے پڑتے یا آلیٹ بنانا پڑتا۔ انڈے بھی تو رلتے پھرتے تھے گھر میں۔ رجو کے گھر جگہ کم تھی، اس نے شستہ کی اجازت سے اپنی کئی مرغیاں اس کے صحن کے ساتھ والی ڈیوڑھی نما گلی میں رکھ چھوڑی تھیں۔ روز کئی ایسی انڈے وہ اس کے منع کرنے کے باوجود بچوں کے لیے وہاں چھوڑ آتی اور یہاں کبوتر کے سائز کے انڈے بھی تیس سے پینتیس روپے درجن تک ملتے۔ دودھ بھی وہ اٹھارہ روپے لیٹر والا لیتی جس پہ جھلی سی ملائی آتی۔ گوالے سے شکایت کی تو جھٹ بولا۔

”با جی آپ بیس روپے والا لگوا لیں۔“

گویا یہاں دودھ بھی قیمت کے لحاظ سے اچھا ملتا ہے۔ وہ کڑھ کے رہ گئی۔ بارہ روپے کلو میں وہ اتنا عمدہ دودھ لیتی تھی جس پر روز سالا بھر کے ملائی کا تر تانے کے اکثر ناشتے میں ٹوس ملائی کے ساتھ ہی کھاتے۔ اکثر آس پڑوس سے بھی تحفتاً دودھ آجاتا۔ سبزیاں بھی اکثر پڑوسی بھجھتے رہتے تھے، کوئی بیکنگ لارہا ہے، کوئی ٹوکری بھر کے ٹماٹر، کسی نے تازہ بھنڈی توڑ کے بھج دی۔ خود اس نے بھی ایک طرف دھنیہ اور پودینہ اگا رکھا تھا۔ اب لاہور میں وہ سبزی کے ساتھ پانچ روپے کے چند پتے دھنیے کے خریدتی تو یاد آتا کہ دھنیا وہ دن میں تین بار اپنی کیاری سے توڑتی۔ یہاں ہر سبزی تقریباً ”دگنی قیمت کی“ تھی۔ بچوں کو اسکول داخل کرانے کا مرحلہ آیا تو نیا مسئلہ پیدا ہوا۔ عام سے درمیانے درجے کے اسکولوں میں بھی فیس تین سو روپے سے کم نہ تھی۔ اچھے معیار کے انگلش میڈیم اسکولز میں چھ سو سے لے کر دو اڑھائی ہزار تک تھی۔ وہ تعلیم کے معاملے میں کمپروماز کرنا نہیں چاہتی تھی چنانچہ علاقے کے ایک اچھے اور بڑے اسکول میں تینوں بچوں کو ہی داخل کرا دیا جہاں یوں تو فیس آٹھ سو

روپیہ تھی مگر تینوں کو اکٹھے داخل کرانے سے چھ سو دونوں کی بالترتیب ایک سو اور دو سو کم کر دی گئی پہلے مہینے بھر کا پچن جتنے بجٹ میں چلاتی تھی وہ دن بڑھ کر دگنا ہونے کے قریب تھا۔ وہ بساط بھر کر کرتی۔ بازار جانا اور پھر ایک ایک چیز ناپ تول کر حساب سے خریدنا، نری درد سری تھی ہاں البتہ مطمئن تھا اور اسے غیر مطمئن کرنے کے خیال۔ اس قدر سہمی ہوئی تھی کہ اپنی پریشانی کو خود بھیجے کی کوشش کرتی تھی مبادا اخراجات اور تنخواہ کا متوازن ہونا اسے ڈگمگانہ دے، پھر بھی نجانے کیسے وہ باتوں باتوں میں مہنگائی کا رونا رو بیٹھی تو انصر نے اسے طعنہ دے دیا کہ لاہور آنا اسی کی خواہش وہی گاؤں کی سادہ زندگی سے ناخوش تھی اب مجھے وہ حسب عادت صرف سوچ کے ہی رہ گئی کہ میری خواہش کے نتیجے میں پوئے سفر عمل میں لایا گیا اور اس سفر سے قبل تو بھی آپ کو یہ خوشی کا خیال نہ آیا اس کی خاموشی کو شرمندگی جانے لگا۔ وہ مزید بولا۔

”اور پھر کوئی سونے کے بھاؤ تو نہیں ملتی ہو سبزی۔ معمولی سا فرق ہی ہو گا۔ تنخواہ میں بھی ہزار کا اضافہ ہوا ہے۔“

”وہ تین ہزار تو آپ اپنے پاس ہی رکھتے ہیں۔ چپ نہ رہ سکی۔“

”اپنے پاس نہیں رکھتا، میٹھی ڈالی ہوئی ہے تمہاری۔ جیسے ہی نکلے گی پلاسٹک پہ مکان کا ڈھانچہ ہی لوں گا۔ اگلی میٹھی میں کچھ اور کام ہو جائے گا۔ آہستہ ہی گھر بنے گا۔ باقی کی تنخواہ تو پوری تمہیں ہوں جس میں سے تمہیں صرف اور صرف کچھ سے یا اپنا اور بچوں کا خرچ نکالنا ہے۔ کوئی کرایہ بل کی درد سری نہیں۔ یہ سہولت کسی کھاتے ہی نہیں آتی۔“ اس نے کئی بار کی کسی بات دہرائی اکتا گئی۔

”ٹھیک ہے، مانتی ہوں مگر یہ بھی تو دیکھو۔ اخراجات بھی اسی حساب سے بڑھے ہیں۔“

اپنا حشر کیا کر لیا ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ تمہاری عمر کیا ہوگی اس وقت؟

”اٹھائیس سال۔“ اس نے بغیر ہنسی مارے شرمندہ سے کہے میں کہا۔

”تم سے چار سال بڑا ہوں میں اور صائمہ آپا مجھ سے دو سال بڑی۔ ان کا بڑا بیٹا کالج پہنچ چکا ہے۔ بیٹیاں قدر برابر آگئی ہیں لیکن دیکھا ہے تم نے اب بھی کتنی فریش اور رنگ نظر آتی ہیں تمہارے تین بچے ہیں تو ان کے پانچ بھرے سسرال میں رہتی آتی ہیں اس لیے تم یہ بھی نہیں کہہ سکتیں کہ تمہیں کام کی زیادتی کے باعث وقت نہیں ملتا خود پہ توجہ دینے کا شادی کو چند سال گزرنے اور بچے بڑے ہو جانے کا مطلب یہ تو نہیں کہ عورتیں اپنا دھیان رکھنا چھوڑ دیں۔ میرے دوستوں کی بیویوں میں سے کئی کو تم جانتی ہو وہ محمود کی بیوی اور وہ تنویر کی اور کچھ نہیں تو آئے دن بالوں کے اسٹائل ہی بدلتی رہتی ہیں۔ تم سے تو اتنا نہیں ہوتا کہ کٹنگ کروا کے بال ہی کسی ڈھب کے کروالو کئی سال سے گر رہے ہیں اب تو چوٹی بھی برائے نام ہی رہ گئی ہے۔“

وہ کھسانی سی اپنی چوہیا سی چٹیا سہلا کے رہ گئی۔ واقعی بال تو رہے نہیں اب چٹیا کا تکلف کرنے کی کیا ضرورت ہے جو گدی سے سکڑتے سکڑتے شانوں تک آتے بالکل ہی معدوم ہو جاتی تھیں۔ شروع میں اس نے گرتے بالوں کو روکنے کی بڑی کوشش کی۔ کئی تیل لگائے آزمودہ ٹوئیل ٹرائی کیے اشتہار دیکھ کے شیمپو منگائے آٹے ریتھے سے بھی سردھویا مگر بے سود اور اب کتنے عرصے سے وہ ان بدستور گرتے بالوں سے یکسر بے نیاز ہو چکی تھی اور نت نئے شیمپو بدلنے سے اس کے بال بھی کہیں کہیں سے سفید ہونے لگے تھے۔

”کپڑے تو خیر تم ہفتے میں دو ہی بار بدلتی ہو منہ بھی لگتا ہے کئی کئی دن ہمیں دھو تیں۔“

”خیر اب ایسا بھی نہیں۔“ اب کے وہ برامان کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہوں۔ اتنی

گندی کیسے رہ سکتی ہوں۔ کپڑے بھی روز بدلتی اور وضو بھی پانچ وقت کرتی ہوں۔ خود ہی سوچ لیں کتنی دفعہ دھلتا ہو گا۔ ہاں اب یہ جھانپاں جو رہی ہیں ان کا کیا کروں۔“

”کپڑے بھی تو تمہارے ایک جیسے رنگوں کے بدلو نہ بدلو ایک برابر۔“ وہ گود میں رکھا تکیہ طرف رخ کر رہا ہر نکل گیا۔

شستہ گھرے دکھ کے احساس تلے اسے دیکھ گئی۔ ایسا نہیں تھا کہ انصر کی کئی گئی تمام باتیں تھیں وہ مانتی تھی کہ بے حد مصروفیت اور بڑھتی ہوئی حالت اس کی کچھ کی کچھ ہو چکی تھی اسے گھر اور بچوں کے ساتھ ساتھ خود پہ بھی توجہ دینا چاہیے یہ اس کی کوتاہی تھی اور انصر کی شکایت اور شوہر نے حق مکر اس کے لیے سے چلتی بیزاری اور اس کا دل چھید گیا۔

اس نے دراز کھنگالے میک اپ کا سارا سامان بچوں کے بعد ڈریسنگ ٹیبل سے غائب ہو کر اس کے سب سے خچے خانے میں جا پہنچا تھا۔ اس نے کئی نیل پالش استعمال نہ ہونے کے باعث اس کی تھیں کئی لپ اسٹیکس تقریباً ”نئی تھیں مگر بڑے ان میں بدبو آنے لگی تھی۔ اس نے وہ پرانی اشیاء پھینک دیں اور نسبتاً ”نئی سنہال لپ“ اور نئی میک اپ کٹ جو پچھلے سال ہی صائمہ کا گفٹ کی تھی سیف سے نکال کر ڈریسنگ ٹیبل دراز میں رکھ دی۔ اس کے بعد دوپہر کی

”صحیح ہی تو کہتے ہیں وہ شادی ہونے اور نہ ہو جانے کے بعد خود سے اس قدر لا پرواہ ہو جانا عقل مند ہی ہے۔“ وہ کپڑے استری کرنے کا فی الحال ملتوی کرتے ہوئے نیم گرم پانی میں ہاتھ کے بیٹھ گئی۔

وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جنہیں گھٹی میں گھول کے پلا دی جاتی تھی کہ ان کی ذات سے ان کو شوہر کو کوئی بھی شکایت پیدا نہیں ہونی چاہیے۔

انصر کے ماتھے پہ بڑی ہلکی سی شکن بھی اسے بے اور مضطرب کر دیتی تھی اور یہاں تو اس نے کھلے میں اس سے گلہ کیا تھا سوا زالہ کرنا تو اس کا فرض تھا۔

بھوکا سودا خریدنے اور بچوں کی فیس دینے کے لیے اس کے پاس کافی رقم موجود تھی لیکن ابھی مہینے کا سترہ مارچ تھی روزمرہ کے خرچے کے علاوہ کسی وقت کوئی اضافی ضرورت پڑ سکتی تھی اس لیے اس نے ان پیسوں کو چھپانے کی ہمت نہ کی۔ پچھلے دنوں اس نے اپنی بار بار اس کے گھر آئے تھے اور جاتے ہوئے اسے تحائف دینے کے ساتھ ساتھ اسے بھی ہزار ہا تحائف گئے تھے۔ اس نے وہی ہزار کانوٹ نکالا۔ اس کی احتیاط کے ساتھ پرس کے اندر دینی خانے میں رکھ کر سنہال لیا تھا کہ کچھ اور جمع شدہ پیسے اس میں رکھ دوں کی سر دیوں کی یونیفارم ہوا لے گی۔

اسی تو خاصے دن میں سر دیاں آنے میں اللہ اور اس کے گھر آئے۔ ”سوچ کر اس نے یہ ہزار خود پہ خرچ کا فیصلہ کر لیا اور اس سلسلے میں برابر کے فلیٹ میں سے مدد لینے کا سوچا کہ ایک تو پوری بلڈنگ اس سے ہی زیادہ دعا سلام تھی اور پھر وہ ان چیزوں کے لیے معلومات بھی خاصی رکھتی تھی اس کی سی سیٹی آج کل ایک پارلر میں بیوٹیشن کا کورس لے رہی تھی۔

اس نے اگلے روز ہی جانے کا پروگرام بنالیا۔ واپسی کے مارکیٹ سے اپنے لیے ہینڈ ڈالٹی ہارنر اور لپ اسٹک کا ایک نیا شیڈ لیا۔ اسی دن اس نے اس کی کٹنگ بھی کر دی اور ہینڈ ڈالٹی ہینڈ نے اسے ایٹن ہلیج اور گھریلو ماسک بھی لکھ دیے۔

انے کے بعد اس نے میرون اور وائٹ پرنٹ کا ۱۸۰ جو اس نے کچھ ماہ قبل ہی سلوایا تھا جبکہ ایک سال تک نئے کپڑے گھر پہ روزمرہ کے میں نہیں لاتی تھی۔ کانوں میں سلور ٹکینے لگے بال بالے پننے برگنڈی لپ اسٹک مسکارا اور

فیس پاؤڈر لگایا، پرفیوم اسپرے کر کے وہ تیار ہو گئی۔ ”یہ باہر کا دروازہ کیوں کھلا ہوا ہے“ بچے کہاں۔ ارے؟“ آفس سے آتے ہی انصر کو اسے دیکھ کر جھٹکا سا لگا۔ سچی سنوری مہکتی، مسکراتی شستہ اسے گزرے دنوں کی یاد دلا گئی جب وہ اسے ہفتے بعد دیکھتا تو وہ یونہی پورے اہتمام سے اس کی منتظر ہوتی، وہ بے اختیار ہی آگے بڑھ کے اسے بازوؤں میں قید کر بیٹھا۔

”کیا کر رہے ہیں بچے دیکھ لیں گے۔“

”سارا گھر خالی پڑا ہے“ بچے کہیں باہر نکلے ہوئے ہیں۔“ وہ اس کے تازہ سیٹ کیے ہوئے بالوں میں منہ چھپاتے ہوئے بولا۔

”ہیں، باہر نکلے ہوئے ہیں اس وقت؟ دیکھو ذرا یہ حال ہے ان کا ذرا توجہ ادھر ادھر کرو، نظر بچا کے بھاگ جاتے ہیں۔“

وہ بچوں کو آوازیں دیتی اسے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی وہ ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔ آج اس نے کھانے پر بھی اہتمام کیا تھا۔ عموماً وہ رات کو ساوہ سا کھانا ہی بناتی ڈال، سبزی وغیرہ۔ ہاں البتہ صبح وہ ضرور اچھا کھانا بناتی کیونکہ انصر آفس میں بچ منگواتا تھا۔ اکثر دوپہر کا کھانا رات کے لیے بھی تھوڑا بہت بچ جاتا تاکہ اگر کسی کو ڈال چا دل یا بھجپا پہ اعتراض ہو تو وہ یہ کھالے لیکن آج اس نے میکرونی اور ایل ڈال کے مایونیز کی سلاد بنائی تھی قیمہ بریانی، آلو کارائنت اور بچوں کا فیورٹ چکن پکڑا۔

”واہ جی واہ۔ آج تو بڑا دل کر لیا ہے بیگم صاحبہ نے ورنہ تو چھٹی والے دن کے علاوہ شاید ہی کبھی ایک سے زیادہ ڈش بنی ہو۔“ انصر نے ٹیبل پہ بیٹھتے ہی کہا۔

”اچھا ہے ناں! ہر روز پکوانوں کی بھرمار ہو تو جلد ہی دل بھر جاتا ہے۔ کبھی کبھی کی تبدیلی مزہ دیتی ہے۔“ اس کے جواب پہ اس نے بھرپور نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں واقعی، کبھی کبھی کی تبدیلی بڑا ہی مزہ دیتی ہے۔“ اس کی وارفتگی پہ گھبرا کے شستہ نے بات ہی بدل ڈالی۔

”انس! یہ کیا صرف سلاو لو گے، چلو شاباش۔“
 تھوڑی سی بریانی بھی لو۔“
 رات کو انصر کے اچھے موڈ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے بات چیت شروع کی۔ ”سینے پتہ ہے آج میں برابر والی یا سمین کے ساتھ مارکیٹ گئی تھی، بیوی پارلر کے لیے۔“
 ”وہ تو مجھے پتا چل گیا ہے میڈم۔ ظاہر ہے تم کوئی سنڈریلا تو ہو نہیں کہ کوئی پری آئی اور اپنی جادوئی چھتری کے زور پر تمہارا حلیہ بدل کر چلی گئی۔۔۔ ویسے سچ رہی ہو۔“ وہ آج حقیقتاً ”چمک رہا تھا۔“
 ”اوہ بات تو سن لیں، پارلر کی اونریا سمین کی کزن ہے، اس نے پارلر کے ساتھ ایک ٹریننگ انسٹیٹیوٹ بھی حال ہی میں شروع کیا ہے۔ اس نے مجھے بھی آفر کی ہے۔“
 ”ٹریننگ لینے کی؟“
 ”نہیں دینے کی۔“
 ”کک۔۔۔ کیا؟“ اس کے لبوں سے لگا چائے کا کپ چھلک گیا۔ ”تم تم ٹریننگ دو گی۔ ڈھنگ سے تیل تک تو لگا نہیں سکتیں میرے بالوں میں، سارا ماتھا اور گردن بھگو کر رکھ دیتی ہو، بال سوکھے کے سوکھے۔ میک اپ کی ٹریننگ کیا خاک دو گی۔“ وہ ہنستا چلا گیا۔
 ”آپ بھی میری بات دھیان سے نہیں سنتے۔“ وہ کچھ کچھ ناراض سی ہو گئی۔ ”وہ ہر طرح کا ٹریننگ انسٹیٹیوٹ ہے جہاں سلائی، کڑھائی، انٹریئر ڈیکوریشن، پینٹنگ، کوکنگ، پیڈی کرافٹس وغیرہ کے کورسز بھی ہوں گے۔ جب اسے پتا چلا کہ میں نے ہوم اکنامکس کالج سے گریجویشن کیا ہے اور فلاور میکنگ، رگ میکنگ، مکرامہ، اسٹین گلاس ورک، فیووک پینٹنگ، پن ورک سب مجھے آتے ہیں تو اس نے بے حد زور دے کر مجھے آفر کی اپنے ہاں جاب کی۔ کیا خیال ہے آپ کا؟ کیا جواب دوں؟ ماحول ہے تو بہت اچھا وہاں کال صرف خواتین کا عملہ ہے۔ ویسے آپ خود بھی نسلی کر لیجئے گا۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے اوہر دیکھا جہاں ایک دم ہی گبیر سنجیدگی چھا گئی تھی۔

”شستہ! کیا واقعی تمہیں جاب کی ضرورت نہیں۔۔۔ مجھے بھلا کیا ضرورت ہے؟“
 میں کوئی جاب ڈھونڈنے نکل تھی، ہاں البتہ ضرورت ہے کسی ایسی خاتون کی جو بیک وقت ہنرمیں ماہر ہو میں نے بھی یہ سوچا کہ بچے اب ماہر بڑے ہو گئے ہیں، اتنا کام نہیں ہوتا ان کا۔ پھر ماہر کی بڑی اچھی ہے۔ صرف دس سے ساڑھے بارہ گھنٹوں کی بس دو کلاسز لینی ہوں گی مجھے اور ہفتے میں دو بھی، یقین کریں، گھر کا بالکل حرج نہیں ہو گا۔ اس پر اس اور پھر ہنر تو آزما تے رہنا چاہئیں ورنہ ہاتھ نہیں رہتے۔“
 ”چلو ٹھیک ہے کر کے دیکھ لو، دل لگ گیا تو ہے ورنہ خواہ مخواہ خود پہ بوجھ لاؤنے کی ضرورت ہے جب تک سہولت سے کر سکو، کر لینا۔“ اس نے اجازت دی تو وہ دل ہی دل میں نعرہ بلند کر کے اس سے پہلے کبھی اس کے دل میں یہ خیال نہ تھا کہ وہ بھی گھر کی گاڑی کھینچنے کے قابل ہو سکتی ہے۔ آج ہی تو اسے یہ اعتماد ملا تھا کہ وہ بھی ہنرمیں پریشائیاں شیر کر سکتی ہے اپنے کنبے کی۔ پورے ہزار آفر کیے تھے اسے مسز سلمان نے، کیونکہ اس صورت میں انہیں تین ٹرینڈ نیچرز مل رہی تھیں۔ وہ بے چوڑے اسٹاف کے بکھیرے سے بچ کر ایک کوکنگ، بیکنگ کے لیے، ایک سلائی کے لیے اور ایک پینٹنگ کے لیے تھی، بیوی کلاسز وہ خود لیتی تھیں اور باقی کے تمام شعبے اس کی بڑی سہولت سے شستہ کے سر ڈال دیے۔ سب ہی کام ایک دوسرے سے متعلق تھے۔ اس وقت میں وہ کسی کو پھول بنانے بھی سکھا دیتی اور مکرانے کی ہنر سمجھا دیتی۔ کسی کو آئل پینٹنگ، پیچ ورک سے بیڈ شیٹیں اور کیشن کورز کو دھو دھو بنانے کے گرتا رہی ہوتی۔ کام اس کی دلچسپی کا لیے وہ اس اضافی ذمہ داری سے گھبرائی نہیں بلکہ اعتماد بحال ہو گیا تھا۔ ہر مہینے ملنے والی ایک کاتصور ہی خوش آئند تھا جو گھر کے کتنے ہی کاموں کے لیے اسے آسانیاں پیدا کر دے گا۔

اس نے دو تاریخ ہے اور ہفتے کا دن۔ کل ہی انصر نے اپنی تنخواہ پکڑائی تھی۔ اس بار کچھ شاپنگ کا بھی کام تھا اس لیے یہ ویک اینڈ امی کی طرف گزارنے کا ارادہ کیا۔ انصر کو وہ صبح ہی آگاہ کر چکی تھی۔
 انصر کے ہاتھ آفس میں لپٹ باکس بھجوانے کے بعد باقی سائن فریج میں رکھا۔ رات کے لیے اس کی اہل کے رکھ دیے۔ نذیر کی روٹیاں، سالن، اٹک دیا۔ انصر کی استری شدہ شلوار قمیص بیڈ روم کے بعد اس نے بیڈ روم اور ڈرائنگ روم کر دیا۔ انصر کے پاس تمام فلی کیٹ چابیاں پہلے سے موجود تھیں۔ نذیر واپسی پر اس کی ہدایت کے مطابق ٹیکسی لیتا آیا۔ وہ اسے ڈھیروں ہدایات دیتی ہیں کہ اس کو اسکول سے لے کر امی کے ہاں چلی آئی۔ اس کی کزن معصومہ جو اس کی بہترین دوست بھی تھی، اسے شہر پر وگرام کے تحت وہاں موجود تھی۔ وہاں ہسپتال کے نیچے نانی کے سپرد کر کے شاپنگ پہ چلی۔

خریدیں جنہیں ضرورت ہونے اور بچوں کی خواہش کے باوجود پچھلے کئی مہینوں سے نظر انداز کر رہی تھی۔
 ایئر فریشنز، شو پیپر کے دو ڈبے، مکچپ کی بڑی بوتل، کسٹرو کے دو فلمورز، اسکواش اور شروت کی بوتلیں، نمکو اور بسکٹ کے پکٹ وغیرہ۔ تمام دالیں اور گرم مسالے بھی اس نے دکنی مقدار میں خریدے تاکہ زیادہ عرصے تک چل سکیں۔ اس نے فٹچ ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے ان کا رخ اور رنگا مارکیٹ کی طرف تھا جہاں سے اس نے میچنگ کی کچھ شلواریں لینا تھیں۔ اس کے جینز، بری میں خاصی ساڑھیاں تھیں جو اب اس کے استعمال میں نہیں آتی تھیں۔ اپنے ہی انسٹیٹیوٹ میں سلائی کے شعبے میں لڑکیوں سے اس نے ان ساڑھیوں کے جدید فیشن کے قمیص دوپٹے بنوائے تھے۔ وہیں پر اس نے سیل سے تولیے، بیڈ شیٹیں بھی لیں۔ اپنے لیے نازک سلور ڈوریوں والی سینڈل اور انصر کے لیے کائن کے دو ہلکے رنگ کے شلوار قمیض کا کپڑا خرید لیا۔ بچوں کے کپڑے اس نے یہ سوچ کر کر دیے کہ گرمیاں ختم ہو رہی تھیں اور سردیاں ابھی آتی نہیں تھیں اگلے ماہ انشاء اللہ بچوں کے گرم کپڑے ہی خرید لیے جائیں گے البتہ انس۔۔۔ کے لیے نیا اسکول بیگ، انعم کے لیے پنسل باکس اور احد کے لیے کلرنگ بکس لے لیے۔ نئے اسکول میں جانے کے بعد سے ہی انس کی فرمائش تھی کہ وہ ایسا ہی نئے فیشن کا بیگ لے گا جو اسکول کے دوسرے کئی بچے لے کر آتے ہیں، جن پہ مشفقہ کمی ماؤس یا ٹیڈی بیر بنا ہو۔ اب کچھ دنوں سے انعم نے بھی ضد پکڑ لی تھی کہ وہ اپنی فرینڈ کے جیسا میوزیکل پیسنل باکس لے گی جس کو کھولنے سے خوب صورت دھنیں سنائی دیتی ہیں۔ شستہ نے وہی باکس اٹھایا مگر قیمت دیکھ کے رکھ دیا اور ایک نسبتاً کم قیمت مگر کیوٹ ساراؤنڈ شیپ باکس لے لیا۔ ”انعم بیٹی ہے اور وہ بھی میری بہل جائے گی۔“ وہ سوچ کر مسکرائی۔ اگلے دن اتوار کو انصر بھی آ گیا۔ دوپہر کا کھانا کھا کے امی اور ابو کے اصرار کے باوجود وہ بس کچھ ہی دیر کے اور بچوں کو سندباد گھماتے

ہوئے گھر چلے آئے۔



”ہیلو، جی ہاں“ میں انصر ملک ہی بول رہا ہوں۔“ انصر کے کسی جاننے والے کا فون آیا تو وہ ریسیور کانوں سے لگائے ٹیبل سے اٹھ کر صوفے تک چلا گیا۔

آج ان کی شادی کی آٹھویں سالگرہ تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے گھر پر ہی انصر اور بچوں کی پسند کے کھانے پکائے، انصر واپسی پر ایک لیتا آیا اور آج تو شستہ کو پہلی بے بھی ملی تھی سو اس کی مسرت دیدنی تھی۔ ابھی وہ ایک کات کے بیٹھی ہی تھی کہ فون آگیا۔ بچوں کو ایک اور سینڈویچ کھلاتے ہوئے بھی اس کا دھیان انصر کی طرف ہی رہا جو مسلسل فون پر کسی سے معذرت خواہانہ انداز میں وضاحتیں پیش کر رہا تھا۔

”جناب میں سمجھتا ہوں آپ کی بات۔ آپ کاروباری بندے ہیں۔ آپ کا تقاضا اور گلہ بالکل بجا ہے مگر یہ بھی تو دیکھیں میری جانب سے یہ تاخیر پہلی بار ہوئی ہے، کل پارسوں آپ تک رقم پہنچ جائے گی۔ جی نہیں میں کل کا وعدہ نہیں کر سکتا ہاں پارسوں ضرور دے دوں گا انشاء اللہ۔“ وہ فارغ ہوئے آیا تو پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

”کون تھا فون پر؟ کون سی رقم کا تقاضا کر رہا تھا؟ آپ نے تو کبھی کسی سے قرض نہیں لیا۔“

”لیا نہیں مگر دے کر پھنس گیا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ حیران تھی قرض مانگنے والے کیا اب اتنا پریشور ڈالتے ہیں کہ بندے کا رنگ ہی فق ہو جائے۔

”یار! وہ فاروقی صاحب ہیں ناں آفس میں انہوں نے پچھلے ہفتے مجھ سے دو ہزار یہ کہہ کر مانگے کہ دو ہی دن میں لوٹا دوں گا۔ مجھے تنخواہ اسی دن ملی تھی اور تم جانتی ہو میرا ذاتی خرچہ کچھ خاص نہیں ہے۔ جہاں کمیشن ڈالی ہے وہاں پانچ تاریخ تک پیسے پہنچانے ہوتے ہیں اس لیے ازراہ ہمدردی انہیں دو ہزار دے دیے۔ اب ادھر کمیشن والے نے شور مچایا ہوا ہے۔ آج آٹھ تاریخ ہے حالانکہ میں ہمیشہ پہلی یا دوسری تاریخ کو ہی

تین ہزار وہاں پہنچا دیتا ہوں۔ وہ فاروقی صاحب ایسے غائب ہوئے ہیں یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا۔“ ہفتے کی چھٹی پر ہیں۔ دیکھو اب شاید کل یا پارسوں پر واپس آئیں تو میری جان چھٹے ورنہ تو اس غصے سے فون کر کر کے نہ گھر میں چین لینے دینا ہے نہ اس سکون سے کام کرنے دے گا۔“ وہ بے دلی سے لہجے چکھتے ہوئے بولا۔

”آپ کیوں فضول کی مینشن لیتے ہیں، دو دن مزید اس کے فون سننے پڑیں گے۔ آپ مجھ سے لیں پیسے، دو ہزار تو میں بھی دے سکتی ہوں مجھے ان ملے ہیں۔ جب فاروق صاحب آپ کو دس کے فون پر مجھے لوٹا دیجئے گا، کم از کم اس کمیشن والے سے تو آج ہی چھڑالیں۔“

”ہاں ٹھیک کہتی ہو، میں نے کبھی کسی سے فون اٹھا کر لیا ہی نہیں، کوئی تقاضا کرے تو عجیب سی احساس ہوتا ہے جیسے میں کسی کی رقم کھا گیا ہوں۔ خدا نخواستہ۔“ وہ بات کرتے کرتے کسی خیال پر چڑھا۔ ”ارے کس اب تم مجھے تو اپنا قرض منانا بنا رہے۔“

”نہیں بھئی! توبہ کریں۔“ وہ ہنسی۔



اتفاق ہے اگلے ہی روز اس کی فیصل آباد والی نازیہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ان کے ہاں آگئی۔ انعم اور احد تو بے حد خوش تھے کہ نازیہ ان ہی کے ہم عمر تھیں اور ان میں دو سنی ہی تھیں۔ خود شستہ کے بھی اپنی اس نند سے معاملہ خاصے دوستانہ تھے کیونکہ صائمہ اور نازیہ اچھا خاصا فرق ہونے کی وجہ سے احترام والا ورنہ تو تینوں میں ہی نندوں والی روایتی خوبو نہیں شکر ہے کہ اس بار اس نے شاپنگ میں ہر چیز کی دگنی مقدار میں خریدی تھی۔ اس لیے باہر سے منگانا نہیں پڑا۔ گوشت مرغی گھی، سب ہی نازیہ کے شوہر کے لحاظ میں اس نے دونوں پر تکلف کھانا پیش کیا حالانکہ وہ بیچاری منع ہی

کے کولڈ ڈرنکس فروٹ وغیرہ میں اس کے پاس کچھ بھی رقم بھی اڑنے لگی۔ اب وہ اپنی اندھا شاپنگ کرنے پر پچھتا رہی تھی۔

”اگر ان ہی ڈھائی ہزار کے خمار میں اتنا خرچا کیا تھا تو کم از کم وہی پاس رہنے دیتی۔“ وہ خود کو گھر کئے لگی۔ ”میں نے مانگتے ہوئے بھی ہچکچاہٹ ہو رہی تھی کہ میں ہی اسے دیتے ہوئے بڑی فراخ دلی سے کہا تھا کہ ہفتہ دس دن نہ بھی دو گے تو کوئی بات نہیں، مجھے اس کی غصے کی ضرورت نہیں۔“

”پلیز، انھیں ناں، مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ انعم کے بچے لاہور میں اس انعم کے ساتھ ہی سو گئے۔ تو وہ پینے کے بعد انصر اٹھ کے بیڈ روم چلا آیا۔ وہ ڈرائیونگ روم میں نازیہ اور اس کے شوہر کے کمرے کے بعد کچن کا پھیلاوا سمیٹ کر سوئے۔ احد کو اٹھائے اندر آئی تو اسے آنکھیں موند گئیں۔

”ابا ہے بھئی، ایسی کیا ضروری بات ہے صبح کو دیکھو ٹھیک بچ رہا ہے۔ صبح مجھے آفس بھی جانا تھا۔“ اس نے تکیہ مٹا کر رکھ لیا۔

”صبح جب آپ انھیں گے۔ میں کچن میں ناشتہ کرنے میں مصروف ہوں گی، میں فارغ ہوں گی تو آپ اس چلے جائیں گے اور بعد میں یہ بات کرنے کا کوئی وقت نہیں۔“

اس کے انداز پر وہ مختصر سا اٹھ بیٹھا۔ ”ہاں“ وہ صائمہ آیا نے پارسوں نازیہ اور ہماری دعوت کی اور نازیہ نے بھی اس سے اگلے روز واپسی کا اہم ہالیا ہے۔

”تو اس میں اتنا رازداری سے آدھی رات کو جگا مانے والی کون سی بات ہے، یہ تو میں پہلے سے جانتا تھا۔“ وہ جھنجھلا تا ہوا پھر سے لیٹ گیا۔

”اوہو، کبھی تو بات پوری سن لیا کریں۔ میرا کہنے کا مطلب ہے کہ نازیہ پہلی بار ہمارے گھر رہنے آئی ہے، اس لیے اسے اور بچوں کو تحائف دینے ہوں گے۔ میں

سوچ رہی ہوں صائمہ آپ کے ہاں سے ہی بازار چلی جاؤں گی۔ ان کے گھر سے مارکیٹ قریب ہے، بچوں کے کپڑوں کی اچھی ورائٹی ملتی ہے وہاں۔“

”کیا یہ سب اہتمام ضروری ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”لو بھلا، کیوں ضروری نہیں ہے۔“ وہ برا مان گئی۔ جب وہ لاہور رہنے آئی تھی اور واپسی پر ہر بار ہی اپنے اس کے اور بچوں کے لیے کپڑے فروٹ اور مٹھائیاں وغیرہ لے کر جاتی تھی تو تب کبھی اس نے ان سب کا ”ضروری ہونا دریافت نہیں کیا تھا۔“

”ضروری کیوں نہیں۔ آپ سے کہہ رہی تھی، ہمیشہ صبح آئی شام کو واپس گئی ہوں مگر اب اللہ رکھے میرے بھائی کا گھر بھی لاہور میں ہے، میرا میکہ ہے یہ میں تو یہاں ہی رہوں گی باقی سب سے صرف ملنے کے لیے جاؤں گی۔ تو جب اس نے آپ کو یہ عزت دی ہے کہ ماں باپ کا درجہ اور مقام آپ کو اور اس گھر کو دیا ہے تو ہمیں بھی اسے میکہ کا مان دینا چاہیے پھر وہ آپ کی چھوٹی بہن ہے۔“

”اچھا اچھا۔۔۔ آگے کہو اب۔۔۔ مسئلہ کیا ہے۔“ وہ جمائیاں روک رہا تھا۔

”اس دن آپ کے لیے کٹن کے جو دو سوٹ لائی تھی، مگر صائمہ آپ کو پسند نہیں آیا تھا، وہ بھائی جان کو دے دیتے ہیں۔ میرے پاس جارحٹ کا ایک پرنٹڈ سوٹ رکھا ہے وہ نازیہ کو دے دوں گی صرف دوپٹہ خریدنا ہو گا۔ ہاں البتہ بچوں کے کپڑے تو بازار سے ہی خریدنا ہوں گے اس کے لیے میرا پروگرام ہے، پارسوں صائمہ آپ کے ہاں سے نازیہ کو ساتھ لے جا کر خرید لوں گی۔“

”میں نے مسئلہ پوچھا ہے شستہ! تم ”حل“ بتا رہی ہو۔ وہ ناگواری سے بولا تو وہ اصل مدعا یہ آئی گئی۔

”دراصل انصر! میرے پاس پیسے بالکل بھی نہیں ہیں۔ بس یہی کوئی ڈیڑھ پونے دو سو ہوں گے۔“ ”کیا! اس کی نیند بھلک سے اڑ گئی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ شستہ نے اسے۔۔۔ مینے کے ختم ہونے سے پہلے تنخواہ ختم ہونے کی خبر سنائی ہو۔“ ”تم ہوش میں تو ہو، ابھی آج بارہ تاریخ ہے اور تم ہاتھ خالی کر کے بیٹھی

